عربی تنقید نگاری

تاریخ، اصول و مسائل

(۱)

جناب محمد سمیع اختر، ریسرچ اسکالر شعبۂ عربی، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

ادبی تنقید :

ادبی تنقید کیا ہے ؟ یہ ایک اہم سوال ہے ۔ عام طور پر نقد ادب کی تعبیر اور سخن شناسی سے کی جاتی ہے ۔ تنقید کسی ادبی تخلیق کے سلسلے میں محض فیصلہ دینے کا نام نہیں ہے بلکہ زبان و بیان کے مختلف اصول و قوانین کی روشنی میں ادبی تخلیقات کی تفسیر و تشریح کرنے کے بعد ان کے محاسن و معائب کو پوری طرح نمایاں کرنا ہے تاکہ اس کی روشنی میں ان کی ادبی قدر و قیمت اور فنی عظمت و بلندی کا اندازہ لگایا جا سکے ۔ بعض لوگوں نے یہ بھی کہا ہے کہ نقد ہر طرح کے اغراض و منافع سے پاک ایسی کوشش ہے جس کے ذریعہ دنیا کی بہترین چیزوں کی کھوج ہوتی ہے ۔ ناقد الفاظ اور معانی کے پردوں میں چھپی ہوئی باریکیوں کو تلاش کرتا ہے ۔ تنقید کا کام صرف ادبی تخلیقات کے بارے میں حسن و قبح کا فیصلہ دے دینا نہیں بلکہ پسندیدگی یا ناپسندیدگی دونوں ہی کے اسباب کی پوری نشاندہی ضروری ہے ۔ گویا فن کار کے مقصد کو سمجھنا، اس کی تخلیقات کی

قدر و قیمت کا اندازہ لگانے اور اس کے عمدہ یا خراب ہونے کے سلسلے میں رائے دینے کا نام تنقید ہے۔

نقد کا دائرہ صرف ادبی آثار و تخلیقات تک محدود نہیں بلکہ اس کا دائرہ نہایت وسیع ہے۔ فلسفہ، تاریخ، لغت، سائنس اور دیگر علوم و فنون میں بھی اس کی ضرورت پڑتی ہے تاریخ و انساب کے عالم کو بھی نقد و نقادی کی ضرورت پیش آتی ہے تاکہ روایت کی مختلف سندوں اور شہادتوں کو صحیح طور پر دیکھ سکے۔ اسی طرح نقاشی، سنگ تراشی، موسیقی جیسے فنون لطیفہ میں بھی نقد کی ضرورت پیش آتی ہے۔ اگر نقد کا وجود نہ ہو تو مختلف اشیاء کے درمیان صحیح و غلط، خیر و شر اور خوب و ناخوب کی تمیز مشکل ہو جائے۔

لغوی تحقیق:

صاحب لسان العرب لکھتے ہیں: "النقد والتنقاد والانتقاد تمییز الدراہم واخراج الزیف منہا" درہموں کو پرکھ کر ان میں سے کھوٹے درہموں کو الگ کرنا۔ تنقاد کا مصدر عام استعمال میں تو نہیں آتا مگر اس کے شواہد عربی زبان میں ملتے ہیں۔ چنانچہ سیبویہ نے ایک شعر نقل کیا ہے ؎

تنفی یداھا الحصی فی کل ھاجرۃ
ونفی الدینار وتنقاد الصیاریف

اونٹنی کے پاؤں پتھریلی وادیوں میں کنکریوں کو اس طرح الگ کرتے ہوئے چلتے ہیں جیسے کہ صراف دیناروں کو پرکھ کر الگ کرتا جاتا ہے

"نقدت الدراہم وانتقدتہا اذا اخرجت منہا الزیف"

"میں نے درہموں کو اچھی طرح پرکھا اور پھر ان میں سے کھوٹے درہموں کو الگ کر دیا" گویا نقد کے معنی صحیح و غلط اور عمدہ و ردی چیزوں کے درمیان تمیز کرنے کے تھے

صاحب لسان نے ایک دوسرے معنی کی طرف بھی اشارہ کیا ہے:

"نقد الشئ ینقدہ اذا نقرہ بالاصبع کما تنقد الجوزۃ"

انگلیوں کے درمیان کسی چیز کو دبا کر توڑنا جیسے بادام کو توڑا جاتا ہے۔ یا "نقدت رأسہ باصبعی" یعنی میں نے اس کے سر پر مارا۔ اس سے یہ صاف ظاہر ہے کہ کسی چیز کی اصل حقیقت کو معلوم کرنا اور اس کی تہ تک پہنچنا نقد کے مفہوم میں شامل ہے۔ حسن و قبح کو بیان کرنا اور پرکھنا دراصل حقیقت تک پہنچنے کی کوشش ہے۔

نقد کا لفظ عربوں کے یہاں عیب جوئی کے معنی میں بھی مستعمل رہا ہے۔ اس کی تائید ابوداؤد کی وہ حدیث کرتی ہے جس میں آپؐ نے فرمایا:

"أن نقدت الناس نقدوك وان ترکتھم ترکوہ"[1]

(اگر تم لوگوں کی عیب جوئی کروگے تو وہ بھی تمھارے عیب نکالیں گے اور جب انھیں تم چھوڑ دوگے تو وہ بھی تمھیں چھوڑ دیں گے۔)

اقرب الموارد نے نقد کے مفہوم میں کلام کے حسن و قبح کے بیان کرنے کو واضح طور پر لکھا ہے۔

"نقد الدراہم نیزھا ونظرھا لیعرف جیدھا من رادیھا"[2]

درہموں کے کھرے کھوٹے کو پرکھنا تاکہ اچھے برے کی تمیز ہوسکے۔

صاحب منجد نے اسی مفہوم کو پیش نظر رکھ کر اس لفظ کو کلام کے محاسن و معائب معلوم کرنے کے ساتھ خاص کر دیا ہے۔

فنِ تنقید کی ابتدا:

دیگر فنونِ لطیفہ کی طرح نقد کی شروعات بھی یونان سے ہوئی۔ ادبیات اور فنون عہد ان میں یونانیوں کی عظمت اپنی جگہ مسلم ہے۔ ظاہر ہے تنقید کی ضرورت اس وقت پیش آتی ہے جب کہ ادبیات موجود ہوں، اور ادب کا تعلق تہذیب و تمدن اور ثقافت و کلچر کی ترقی سے ہے۔ تاریخ عالم میں جس قوم کے اندر تہذیب و تمدن کے آثار سب سے پہلے نمایاں ہوئے وہ یونانی قوم ہے۔ انھوں نے ہر زمانے اور ہر دور میں وقت کے تقاضوں کے مطابق ایسی شعری تخلیقات کو وجود دیا جو ان کی اجتماعی، سماجی اور ثقافتی زندگی کی ترجمان تھیں۔ یہ امتیاز صرف یونانی ادب کو حاصل ہے جب کہ لاطینی، فرانسیسی یا انگریزی ادبیات میں کسی خاص دور کے اشعار کو دیکھ کر اس دور کی سماجی، فکری اور تہذیبی زندگی کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا۔ اس طرح اہل یونان کے اندر شروع ہی سے نقد کی صلاحیتیں موجود تھیں اور ان صلاحیتوں کا اظہار اس وقت ہوا جب کہ سخن شناس یونانیوں کو شعرا کی تخلیقات کے محاسن و معائب کی نشاندہی کی ضرورت پیش آئی۔ ابتدا میں ان کے پاس نقد کے مقررہ اصول نہ تھے بلکہ اس کا تمام تر دارومدار ان کے ذوق پر تھا۔ یونانیوں نے اپنی ادبی زندگی کی شروعات دعا و مناجات کی شاعری سے کی۔ اس طرح کے اشعار کو ان کی زبان میں ہیمنوس (HYMNUS) کہتے تھے۔ اس صنف سے تعلق رکھنے والے شعرا کے نام و نشان تقریباً مٹ چکے ہیں۔ اس کے بعد طوائف الملوکی کا دور شروع ہوتا ہے جب کہ حماسی شاعری کو فروغ ملا۔ اس کے اندر قوم کے بہادروں، سورماؤں، پہلوانوں اور یونانیوں کے کارنامے بیان کئے گئے۔ ہومر (HOMER) اور ہزیوڈ (HESIODE) کی شاعری اس عہد کی ترجمان ہیں۔ ایلیڈ (ALIAD) اور اوڈیپس (ODEPUS) یہ دو

منظوم کلام ہومر کی طرف منسوب ہیں۔ حماسی شاعری کے بعد آٹھویں صدی قبل مسیح شعر غنائی (LYRES) کا ظہور ہوا جو غزل، مرثیہ، ہجو تمام ہی اصناف پر مشتمل تھا۔ تمثیلی شاعری (DRAMATIC) کا وجود چھٹی صدی قبل مسیح سے ہوا۔ اس طرح کی شاعری میں کسی موثر اور عبرت آموز حادثے کو شعر کی زبان میں عملی حرکت دے کر پیش کر دیا جاتا تھا۔ اس کے بعد طربیہ (COMEDIE) شاعری وجود میں آئی۔

پی زستریت :

افلاطون اور ارسطو سے قبل نقد ادبی کی تاریخ کچھ زیادہ مرتب طور پر نہیں ملتی تاہم پی زستریت (PISISTRATE) جو قبیلہ اتھنز (ATHENS) کا معروف سردار تھا، یونانی ادب کا سب سے قدیم ناقد تصور کیا جاتا ہے۔ اس کا زمانہ چھٹی صدی قبل مسیح تھا۔ یہ وہ پہلا شخص ہے جس نے ہومر (HUMER) کی تخلیقات کو مدون و مرتب کرنے کی کوشش کی۔ اسی طرح اتھنز میں بعض ایسے سخن شناس شیوخ بھی تھے جو ادبی تخلیقات اور شعر و شاعری کے ضمن میں حکم کا فریضہ انجام دیتے تھے۔ ان کو اس بات کا پورا حق حاصل تھا کہ وہ کسی شاعر کی تخلیق کو قبول کریں یا رد کر دیں۔ اس کے بعد مشہور شاعر ارسٹوفان (ARISTOPHANE) کا شمار بھی قدیم یونانی ناقدوں میں ہوتا ہے۔ اس زمانے میں طربیہ شعراء لوگوں کے تبصرے اور خیالات کی واقفیت حاصل کرنے کی غرض سے اپنی تخلیقات کی نمائش کرتے۔ چنانچہ ادبی ذوق رکھنے والے حضرات ان کے متعلق اپنی رایوں کا اظہار کرتے کہ شاعر اپنے مقصد میں کہاں تک کامیاب ہے۔ ارسٹوفان نے اکثر مزاح و استہزاء کے انداز میں تنقید کی ہے۔

سقراط :

سقراط کے تنقیدی نظریات کا سارا فلسفہ اخلاقیات پر مبنی ہے۔ یہی وجہ ہے

کہ اس نے شعروشاعری کی طرف چنداں توجہ نہیں دی اور اسے لغو و عبث قرار دیا۔ اس نے اپنے مختلف رسائل، مکالمات اور خطبوں میں شعراء اور ان کی شعری تخلیقات پر تنقید کرتے ہوئے ان کا مرتبہ و مقام ان لوگوں سے کمتر ثابت کرنے کی کوشش کی جو کہ اصلاحی و تعمیری کوششوں میں مصروف تھے۔ وہ نہ صرف اشعار بلکہ دیگر فنون لطیفہ کو بھی اخلاقی نقطۂ نظر سے دیکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ اخلاقی بنیاد کا پر اشعار کے حسن و قبح کا فیصلہ کرتا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ اشعار صرف لطف و لذت کے حصول کا ذریعہ ہیں ان کا خیر و شر سے کوئی سروکار نہیں۔ بسا اوقات تو وہ ان کے حسن و زیبائی اور رعنائی و دلکشی تک سے انکار کر دیتا ہے۔ وہ افلاطون کو خاطب کرتے ہوئے ایک رسالے میں لکھتا ہے:

"میں نے ندائے غیبی کے کلام کی حقیقت تک رسائی حاصل کرنے کی تمام کوشش کر ڈالی اب میں تمھاری خاطر ان کو بیان کرتا ہوں۔ میں نے نامور صاحبان دولت و ثروت کو دیکھا، شعراء کی خدمت میں حاضر ہوا اور مجھے یقین تھا کہ میری جہالت ان لوگوں کے طفیل مجھ پر ظاہر ہو جائے گی۔ اپنے علم کی خاطر جملوں کی تفہیم کرنی چاہی۔ مجھے شرم آتی ہے مگر اظہار حقیقت پر مجبور ہوں کہ حاضرین مجلس نے ان شعراء سے بہتر توجیہیں کیں۔ میں فوراً سمجھ گیا کہ شعراء کے کلام کا سرمایہ فہم و دانش پر نہیں بلکہ فطری جذبات اور شوق و ذوق پر مبنی ہوتا ہے۔ جیسا کہ کاہنوں کا معاملہ ہے کہ خود بخود شیریں کلمات ان کی زبان سے ادا ہو جاتے ہیں اور یہ خود نہیں جانتے کہ وہ کیا کہہ رہے ہیں۔ اشعار کو نظم کرنے کے بعد شعراء خود کو

زیادہ دانشمند انسان خیال کرتے ہیں حالانکہ ان کی بابت ان کو کچھ علم نہیں ہوتا" ؎

افلاطون:

نقدوادب کے سلسلے میں افلاطونی افکار و نظریات کے مطالعے کے بعد یہ ظاہر ہوتا ہے کہ شعر و شاعری کے ضمن میں اس کا رویہ اپنے استاد سے کچھ مختلف تھا۔ وہ فنون لطیفہ کی قدر و قیمت اور شعراء کی عظمت و بلندی کا معترف تھا۔ اس نے جا بجا اپنی کتابوں میں شعر و شاعری کے بارے میں اپنے اور سقراط کے خیالات کو دل نشیں انداز میں پیش کیا ہے۔ وہ اشعار کو بیخودی کا غلبہ اور الہامی کیفیت کا نتیجہ بتاتا ہے وہ کہتا ہے کہ اگر یہ مخصوص حالت کسی پر بھی مستولی ہو جائے تو وہ اس کو اپنے سے بے خود کر دیتی ہے۔ غیبی جذبے اور الہامی کیفیت کے بغیر اشعار میں جان نہیں آسکتی۔ افلاطون نے اپنی کتاب "فردوس" میں شعر کو بطور کنایہ ہذیان کی ایک قسم، شاعر کو آشفتہ سر، پریشان حال، از خود رفتہ بتایا ہے۔ اس نے مختلف انسانوں کا مرتبہ قائم کرتے ہوئے شاعر کو نویں مقام پر رکھا ہے۔ وہ فلسفی اور شاعر کے درمیان طویل فاصلے کا قائل ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اپنے استاد سقراط کی طرح اس کے نزدیک شعراء کا کوئی اہم مقام نہیں ہے ؎ مختصر یہ کہ افلاطون جب شعر کو فن و ہنر کی کسوٹی پر پرکھتا ہے تو اسے تخیلاتی دنیا کا شاہکار بتاتا ہے لیکن وہی افلاطون جب اسے حکمت و اخلاق کی نظر سے دیکھتا ہے تو اس کی تمام تر زیبائی و دلکشی کو نظر انداز کرتے ہوئے اسے معاشرے کے لئے غیر مفید اور کار عبث تصور کرتا ہے۔ وہ اس کتاب میں اس بحث کو بھی چھیڑتا ہے کہ آیا شاعری انسانوں کی رہنمائی مکارم اخلاق اور انسانی فضائل کی طرف کرے گی یا اسے ہلاکت و بربادی کے

کھ تک لے جائے گی۔ اس طرح وہ اس مسئلے سے بحث کرتا ہے کہ شاعرانسانی سماج کے لئے کوئی بڑا خطرہ ہے جس سے اجتناب کرنا چاہیئے یا نعمت ہے جسے ہمیشہ دیکھ کر شاد ہونا چاہیئے؟ اسی طرح وہ اپنی شہرۂ آفاق کتاب جمہور (REPUBLIC) میں قوم کے ہونہار اور باشعور نوجوانوں کو شعراء کے سائے اور ان کی گمراہیوں سے دور رکھنا چاہتا ہے۔ وہ اپنے نوجوانوں کو قصے اور داستانوں سے بھی دور رکھنا چاہتا ہے کیونکہ ان کے خیال کے مطابق یہ چیزیں انسان کو ذہنی طور پر مفلوج و ناکارہ بنا دیتی ہیں۔ اس نے ہومر (HUMER) کے قصے کہانیوں کی تعلیم کو بھی بچوں کو ممنوع قرار دیا ہے۔ ان دو کتابوں کے علاوہ اس نے اپنے دوسرے رسائل میں بھی شعر و شاعری سے متعلق مفید بحثیں چھیڑی ہیں۔ وہ فخر و حماسہ سے متعلق اشعار کو پسند کرتا ہے۔ اس کے تنقیدی نظریات کا لب لباب یہ ہے کہ شعر کوئی علم نہیں ہے کہ کچھ متعینہ اصول وضوابط سے واقفیت حاصل کرنے کے بعد اس پر قادر ہوا جاسکے اور نہ دوسروں کو تعلیم کے ذریعہ سکھایا جاسکتا ہے بلکہ اس کا شمار الہامی امور میں ہوتا ہے۔ اس کا تعلق صنعت وفن سے بھی نہیں کیونکہ ہر فن کے کچھ اصول وضوابط ہوتے ہیں جبکہ ذوق اور الہامی کیفیت کو کسی اصول کا پابند نہیں کیا جاسکتا۔ اس نے اپنے معاصر شعراء پر طنز و ہجو کے انداز میں تنقیدیں کی ہیں۔ اخلاقی واصلاحی نقطۂ نظر سے ادبی تنقید کے سلسلے میں اس کے خیالات سقراط سے بہت حد تک ملتے جلتے ہیں۔

ارسطو

سقراط اور افلاطون نے شعر و ادب کو الہامی قوت کا نتیجہ بتاتے ہوئے اس کے اخلاقی اصول وضوابط کا پابند بنانے کی کوشش کی اور شاعرانہ عظمت وجدت کو تسلیم نہیں کیا۔ ان کے برخلاف ارسطو نے منطق و فلسفہ کی بنیاد پر ادبی تخلیقات کے کچھ اصول وضوابط کا پابند بنانے کی کوشش

کی اور ان کی قدر وقیمت اور مقام کے تعین کے لئے کوئی معیار بنانا چاہا۔ چنانچہ ارسطو کو یونان کے ادبی نقد کا موجد تصور کیا جاتا ہے۔ اس نے اپنے مختلف رسائل و کتابوں میں ادبی و علمی نقد سے متعلق ہر چھوٹے بڑے مسئلے کو بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔ ارسطو نے شعر و نقد کے موضوعات پہ بہت کچھ لکھا۔ اس ضمن میں اس کی کتاب "فن شعر" کافی مشہور ہے۔ اس کی دوسری مشہور کتاب بدی داس کالی (DIDASCALIE) بتائی جاتی ہے جو اب موجود نہیں۔ بتایا جاتا ہے کہ اس کتاب میں دیونیروس (DIONARYSUS) کے تہواروں پر منعقد ہونے والے ادبی و شعری مقابلوں کا تذکرہ تھا۔ اس کے اندر اس نے ان مقابلوں میں شریک ہونے والے شعراء اور ان کے حالات و تخلیقات سے متعلق قیمتی معلومات فراہم کی ہیں۔ شعر و تنقید کے سلسلے میں اس کے دوسرے قیمتی رسائل ضائع ہو گئے ہیں جب کہ فن شعر کو محفوظ کر لیا گیا ہے اور یہی ایک کتاب اس کی ناقدانہ عظمت کے ثبوت کے لئے کافی ہے۔ یہ رسالہ خاص طور پر المیہ و حماسہ سے متعلق دقیق معانی و مطالب پر مشتمل ہے۔ اس رسالے کے اندر اس نے شعر کی ماہیت اس کے اصول و مبادی سے بحث کرتے ہوئے شعر و شاعری کے متعلق افلاطون کے اعتراضات کا جواب دیا ہے۔ اس نے شعر کے جمالیاتی پہلو کو اس کے اخلاقی پہلو سے الگ کر کے دیکھنے کی کوشش کی ہے۔ یہ کتاب چھبیس فصلوں پر مشتمل ہے۔ مقدمے کے اندر اس نے شعر کی تعریف، اس کے انواع و اقسام، نفسیاتی محرکات اور شاعر کی ذہنی کیفیات اور قلبی واردات کا جائزہ لیا ہے فصل ایک سے پانچ تک المیہ شعر و شاعری پر تحقیقی بحث کی ہے۔ اس سے متعلق تمام اجزاء اور خوبیوں کو بیان کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ فصل ۶ تا ۲۳ جملہ انواع شاعری کا سرسری جائزہ ہے۔ فصل ۲۳ اور ۲۴ میں نقد اور نقادی سے متعلق بعض اہم مسائل کا اختصار کے ساتھ ذکر ہے۔ فصل ۲۵ میں اختصار کے ساتھ المیہ اور

نظریہ شاعری کے درمیان اجمالی طور پر موازنہ کیا گیا ہے۔ اور فصل ۲۶ پر یہ کتاب ختم ہوجاتی ہے۔

ارسطو نے تخلیق شعر کے سلسلے میں دو اسباب کی طرف اشارہ کیا ہے۔ ایک تقلید فطرت اور دوسرا وزن و نغمگی۔ تقلید فطرت انسانیت ہی کا نام ہے جو انسان کے اندر عہد طفولیت ہی سے پوری طرح موجود ہوتی ہے۔ وہ اپنی زندگی کی شروعات ہی تقلید سے کرتا ہے۔ وزن اور نغمہ کے ساتھ بھی انسان کا فطری لگاؤ ہے۔ اس کا خیال ہے کہ یہی دو قوتیں انسان کے اندر شاعرانہ صلاحیتوں کو درجہ کمال تک پہنچاتی ہیں۔ المیہ شاعری پر گفتگو کرتے ہوئے کہتا ہے کہ وہ ایسی شاعری ہے جس کے طرز بیان میں لطافت وشیرینی ہو۔ مضامین میں رفعت و بلندی ہو، ان کا صرف پڑھ دینا ہی کافی نہیں بلکہ اس میں پیدا شدہ مضامین اور اداکاروں کے حرکات و سکنات کچھ اس طرح ادا کئے جائیں کہ سامعین کے اندر جذبۂ شفقت و ترحم پیدا ہو۔ موضوع میں وحدانیت ہو، اس کا ہیرو ایک ہو، ساتھ ہی شاعر کو اس بات کا بھی لحاظ کرنا چاہیئے کہ داستان کے اندر شرفاء و نیکوکاروں کو ان کی شرافت و نیکی کے بدلے میں انجام بد سے نہ دوچار ہونا پڑے۔ اور نہ ہی داستان کا رخ ایسا ہونا چاہیئے کہ شرپسندوں کو ان کی شرارت کے نتیجے میں قصداً یا اتفاقاً سعادت وکامیابی میسر ہو۔ المیہ کے ہیرو کو نہ تو حد سے زیادہ خراب ہونا چاہیئے اور نہ ہی انداز سے زیادہ شریف بلکہ عام اور معمولی انسان کی طرح ہونا چاہیئے۔ وہ مختلف صفات کے انتساب میں بھی احتیاط کی دعوت دیتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ جو صفات اس ہیرو کی طرف منسوب کئے جائیں، وہ فطری، اس کے شایان شان اور ممکن الوجود ہوں۔ مثال کے طور پر شجاعت، جرأت، بہادری، بے خوفی وغیرہ پسندیدہ اوصاف ہیں مگر یہ مرد کی خوبیاں ہیں اگر ان کی نسبت عورتوں کی طرف کردی جائے تو یہ ناپسندیدہ امر ہوگا

اسی طرح اس نے زبان و بیان سے متعلق بھی کچھ اصولوں کی طرف اشارہ کیا جو تقریباً تمام مہذب زبانوں میں مشترک ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ عمدہ بیان اور اچھی بات کے لیے ضروری ہے کہ اسے واضح، سہل، عام فہم اور فصیح الفاظ میں ادا کیا جائے جو اشکال و ابہام سے خالی ہو یعنی الفاظ حقیقتاً جس مفہوم کے لئے وضع کئے گئے ہیں اسی معنی میں استعمال کئے جائیں۔ کلام مبہم اور مشکل اس وقت ہوتا ہے جب کہ الفاظ اپنے وضعی معنی سے ہٹ کر استعمال ہوتے ہیں۔ شاعر کا کمال یہ ہے کہ جس موضوع کو وہ بیان کرنا چاہتا ہے اسے وہ موزوں الفاظ کے انتخاب اور تصویر کشی کے ذریعہ مجسم بنا دے۔ اس کے کلام پر اس صورت میں تنقید نہیں کی جا سکتی جب کہ وہ سائنس، طب یا علم نجوم کے اصولوں کے خلاف ہو بلکہ اس وقت اس کا کلام تنقید کا ہدف بن سکتا ہے جب کہ اس کے اندر تقلید و محاکاۃ کی کوئی کمزوری یا زبان و بیان کے اصولوں کی خلاف ورزی ہوئی ہو۔ ایسے علوم و فنون جن کا شاعری سے کوئی ربط نہیں ان کی خلاف ورزی پر اس کی گرفت نہیں کی جا سکتی۔

رسالہ "فن خطابت" میں بھی ارسطو نے نقد ادب سے متعلق مفید اور قیمتی تحقیقات پیش کی ہیں۔ اس کے اندر اس نے فن خطابت کے اصول و قواعد اور فصاحت و بلاغت کے معیار کو واضح کیا ہے۔ انسانی نفسیات اور موقعہ و محل جیسے موضوعات سے بحث کی ہے۔

ارسطو کے بعد اس کے شاگردوں کی ایک لمبی فہرست ملتی ہے مگر نقد کے باب میں اس نے جو بلند مقام حاصل کیا وہ کسی اور کے حصہ میں نہ آسکی۔ اس کے جانشینوں نے ارسطو کے تنقیدی نظریات کی مزید تشریح کی۔ اس کے نامور شاگردوں میں تھیو فرسیٹ (THEOPH RASTE) اریستارک (ARISTARQUE) وغیرہ کا نام لیا جا سکتا ہے۔ اریستارک نے قدیم فنون

کی تصحیح و تحقیق میں بالغ نظری کا ثبوت دیا۔ پوری کوشش کے ساتھ ہومر (HUMER) کی تخلیقات کے قدیم نسخوں کو جمع کر کے غلط اشعار جو ان کے اندر داخل ہو گئے تھے خارج کیا۔ اصلی اشعار کو جعلی اشعار سے ممیز کرنے کے لئے بڑی محنت، مہارت اور جانفشانی کا ثبوت دیا۔ ان کے علاوہ ہرمیپ دی سیمپن (HERMIPPE DE SAMPAN) آرسیتوکسن (ARISTOXEN) لوسیانوس، لونگینوس وغیرہ مشہور رہیں۔ ان لوگوں نے تنقیدی نظریات کو پختگی عطا کی، حسن و قبح کے اصول وضع کئے اور ایک ناقد کے لئے ضروری اوصاف کی نشاندہی کی۔ ان اسباب کا ذکر کیا جن کے ذریعہ غلط احادیث تاریخی روایات کا حصہ بن جاتی ہیں۔ تنقید کے اندر صداقت، عدالت اور غیر جانبداری کے اصولوں کو متعارف کرایا۔ تشبیہ، استعارہ، مجاز، کنایہ وغیرہ کے مواقع استعمال کی تفصیل بتائی ہے۔

روم میں نقد:

درحقیقت روم کی تاریخ جنگ و جدال اور معرکہ وغزوات کی تاریخ ہے۔ وہاں کے افراد شجاعت و بہادری، ہمت و جوانمردی، جرأت و بیباکی کے لئے جس کا محبوب مشغلہ قتل و غارت گری رہا ہو بعید نہیں کہ صدیاں گذر جانے کے باوجود بھی جہاں شعر و ادب کا وجود نہ ہو۔ اس قوم میں ادبیات کی تاریخ اس وقت شروع ہوتی ہے جب کہ وہاں یونانی تہذیب و تمدن کے آثار نمایاں ہ یونانیوں کی آمد سے قبل وہ شعر و ادب کے وجود سے واقف نہ تھے۔ اس معاشرے میں صرف بہادر سپاہیوں اور سورماؤں کی قدر و عزت تھی۔ وہاں شعر فلاسفہ کو بے کار اور غیر مفید عنصر تصور کیا جاتا تھا۔ یہ لوگ ادبی ذوق سے

وقت آشنا ہوئے جب کہ انھوں نے یونان کو مسخر کر کے ان کے شعر و ادب اور علم و حکمت کے سرچشموں تک بازیابی حاصل کی۔ پھر رفتہ رفتہ یونانی ادبیات کے اثرات کی بدولت ان کے اندر بھی ادبی تخلیق کا ذوق پیدا ہوا۔ کچھ زیادہ عرصہ نہیں گزرا کہ رومیوں نے یونانیوں کی تقلید شروع کر دی۔ یونانی طربیہ نویسوں (COMEDY) کی ابتدائی تخلیقات میں یونانی تہذیب و تمدن کے اثرات نمایاں ہیں۔

فن نقد کے میدان میں رومیوں کے یہاں پہلا باقاعدہ نام لوسیوس ایلیوس ستلو (SOUCIUS AELIUS STELLO) کا ملتا ہے۔ اس نے قدیم لاطینی ادبیات کی طرف توجہ کی۔ اس نے لاطینی شاعر پلاٹ (PLAUTE) کی تخلیقات کی چھان بین کی اور ان کے بارے میں نہایت نفع بخش تحقیق پیش کی۔

سسرو:

یہ روم کا مشہور و معروف خطیب اور ناقد ہے۔ اس نے فصاحت و بلاغت کے اصولوں سے بحث کی۔ زبان و ادب سے متعلق موضوعات پر رسالے اور کتابیں تصنیف کیں۔ اس کا رسالہ (DE-LORATEUR) خطیب فن خطابت میں رہنما کتاب کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس رسالے میں اس نے خاص طور سے اس بات پر زور دیا ہے کہ بلاغت ایک وہبی اور فطری صلاحیت ہے کسبی اور علمی نہیں۔ اگر کسی کے اندر بلاغت کے ذرات موجود ہیں تو مشق و ممارست کے ذریعہ اس میں پختگی پیدا کی جا سکتی ہے لیکن اسے تعلیم و تربیت کے ذریعہ پیدا نہیں کیا جا سکتا۔ اس نے فلسفہ اور خطابت کا دائرہ الگ کرنے کی کوشش کی۔

کہتا ہے کہ خطیب کا کام عوام کے اندر جوش و حرکت پیدا کرنا ہے جب کہ فلاسفر کا مقصد عوام کی عقل اور عقلی نشو و نما کرنا اور ان کے ذہن کو پر سکون بنانا ہے۔ اس نے ہر ایک کے مختصات کو تفصیل سے بیان کیا ہے۔ شاعری کے سلسلے میں سسرو کے خیالات سقراط اور افلاطون سے ملتے جلتے ہیں۔ وہ بھی شاعری میں الہام کا قائل تھا۔

ہوریس:

سسرو کے بعد جس شخص کو نقد کے میدان میں شہرت ملی وہ شاعر ہوارس ہے۔ اس کی تخلیقات کچھ زیادہ نہیں ہیں لیکن ادبی تنقید سے متعلق اس کے خیالات نہایت قیمتی ہیں۔ وہ مختلف لوگوں کو لکھے گئے خطوط میں ان خیالات کا اظہار کرتا ہے۔ وہ عوام کے ادبی ذوق کو بلند کرنا چاہتا ہے۔ وہ روم کی ادبی مجلسوں پر تنقید کرتا ہے کہ سامعین بغیر غور و فکر کے ایک دوسرے کے اشعار کی تحسین و تعریف کرتے ہیں۔ وہ شعراء کی کمزوریوں کی طرف بھی نشاندہی کرتا ہے۔ قدیم شعراء کی ناتجربہ کاری، الفاظ میں غروبت و خشونت کا تذکرہ کرتا ہے۔ وہ شعر و فن کے میدان میں عقل و منطق کی آمیزش کا قائل ہے۔ اس کے ساتھ وہ اشعار میں نظم و ضبط اور موضوع میں وحدت پر زور دیتا ہے۔ نظم و ترتیب کی رعایت ہی سے کلام کے اندر خوبصورتی و دلکشی پیدا ہوتی ہے۔ وہ شاعری کو تفریح و دل لگی کا ذریعہ نہ تصور کرتے ہوئے ایک باوقار اور سنجیدہ فن تصور کرتا ہے۔ اس کے بعد روی نقد میں سنکا (SENCA)، کیتی لین (QUITILIEN) اور تاسیت (TACITE) وغیرہ کے نام لئے جا سکتے ہیں۔ ان کی تنقید کا بیشتر سرمایہ فصاحت و بلاغت کے قواعد اور شعر و خطابت کے اصولوں کی تفسیر پر موقوف تھا۔

عربی تنقید نگاری کی ابتداء :

ٹھیک اسی طرح عربی تنقید نگاری کی شروعات بھی ہوئی۔ ایک طویل عرصے تک عربی تنقید کسی متعین اصول وقاعدے کے بغیر چلتی رہی۔ ادباء وشعراء تنقیدی اصولوں کے بغیر فطری انداز پہ اپنے اشعار پیش کرتے رہے۔ ابتدا میں عربی نقد کا تمام تر دارومدار ذوق پر تھا اور ذاتی پسندیدگی وناپسندیدگی ہی اصل معیار تھا۔ انفرادی نظریات کی بنیاد پر وہ کسی شعر کو دوسرے شعر سے افضل یا کسی شاعر کو دوسرے شاعر سے بہتر قرار دیتے تھے۔ عربوں کے قدیم ترین نقد کے نمونے جاہلی زمانہ کے میلوں میں ملتے ہیں۔ عربوں کو جاہلی دور میں شعروشاعری سے جنون کی حد تک لگاؤ تھا۔ انھوں نے اپنے احساسات، خیالات افکار، نظریات، مفاخر وکارناموں غرضیکہ شب وروز کی تمام سرگرمیوں کو اشعار کے اندر بیان کر دیا۔ یہی وجہ ہے کہ دور جاہلیت کی شاعری کو "دیوان العرب" کہا جاتا ہے۔ بعض محققین کو جاہلی شعروادب کی صحت میں تردد ہے اور وہ اس پورے ذخیرے کو تسلیم کرنے سے انکار کرتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ جاہلی شعروادب کے نام پر جو کچھ ہم تک پہنچا ہے وہ تاریخی اعتبار سے معتبر نہیں۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اشعار کے راویوں (حماد راویہ، خلف احمر) نے بذات خود اشعار کہہ کر جاہلی شعراء کی طرف منسوب کر دیئے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ بعض اشعار کی صحت انتساب مشکوک ہے مگر کلی طور پر جاہلی شعروادب کی تکذیب نہیں کی جا سکتی۔ نقل وروایت کا وہ طریقہ جس کے ذریعہ ہو کر جاہلی اشعار ہم تک پہونچے ہیں کسی طرح مطعون نہیں ہو سکتا کیونکہ تمام قدیم قوموں کے ادب بھی انھیں راہوں سے گذر کر اخلاف تک پہونچے ہیں۔

(باقی)